© rasailojaraid.com

سیّداحمد شہید کی تحریکِ جہاد کا توڑ کرنے کے لیے جو برعظیم پاک و ہند میں مغربی استعمار اور 'سکھا شاہی' کے لیے مزاحمت کی سب سے بڑی قوت تھی، جو مختلف فتنے جنم دیے گئے ہیں، اِن میں ایک 'قادیانیت' کا فتنہ بھی تھا۔ مذہبی فرقہ پرستی کا فتنہ بھی تھا اور اسی تسلسل میں ہندو احیا پرستی کا اقدام بھی تھا۔

انیسویں صدی میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اور خصوصیت سے تحریکِ مجاہدین کے مقدمات اور ۱۸۸۴ء میں ان کا جو آخری مقدمہ قائم ہوا، اس میں آپ دیکھیں گے کہ برہمنوں کی زیرِقیادت ہندو قوم پرستی کا بخار پروان چڑھ چکا تھا۔ 'دھرتی ماتا' کی محبت اور دھرم سے شیفتگی کے اس نسل پرستانہ نعرے کی رہنمائی اور آبیاری انگریزوں نے کی تھی۔ اس وقت سے لے کر پہلی جنگِ عظیم کے بعد تک ہندو بنیاد پرستی اور ٹھیٹ ہندو قوم پرستی سے سرشار پُرتشدد تحریک اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں ہندو مسلم فسادات رُونما ہوئے اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اسی دوران مسٹر گاندھی کے باطن میں چھپا ہوا برہمن بے نقاب ہوا تھا۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۴ء سے پہلے برعظیم کی تاریخ میں مسلمانوں کے ۹۰۰ سالہ دورِ اقتدار اور انگریز کے سو سالہ دور میں کبھی ہندو مسلم فساد رُونما نہیں ہوئے تھے۔

برہمنی نفرت کے انھی شعلوں کی بنیاد پر ۱۹۲۵ء کو پہلے تو 'راشٹریہ سوامی سیوک سنگھ' (RSS) قائم ہوا۔ اگرچہ اس کے بانی کیشو ہیڈگوار [م: ۱۹۴۰ء] تھے مگر پنڈت مدن موہن مالویہ اس کے فکری لیڈروں میں سے تھے، جو پہلے پہل تو ہمارے ہندستانی مسلم قائدین مولانا محمدعلی جوہر، عبدالباری فرنگی محل، قائداعظم اور دوسرے اکابر مسلمانوں کے ممدوح تھے، لیکن مسلمان قائدین کی وسعتِ قلبی اور وسیع المشربی بھی گاندھی جی اور موہن مالویہ جی کے ذہن میں جمے ہوئے برہمنی تعصب اور تنگ نظری کو نہ دھو سکی۔ یہ پارٹی ہندو مذہبی انتہاپرستی اور ہندو قوم پرستی پر مبنی تھی اور اس نے غیرمنقسم ہند میں باقاعدہ مسلح جتھے منظم کر رکھے تھے۔ پھر اس پارٹی نے ۱۹۵۱ء میں اپنے سیاسی بازو 'بھارتیہ جن سنگھ' کو جنم دیا اور آخرکار ۱۹۸۰ء میں 'بھارتیہ جنتا پارٹی' کا رُوپ سامنے آیا۔ اب اگر برہمنی تعصب اور مسلمانوں سے نفرت کے ارتقا کو کچھ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام کی تحریک کا ردِعمل قرار دیتے ہیں تو یہ ان کی علمی بددیانتی ہے۔ لیکن جو مسلمان ان کی ایسی باتیں سن کر اسلامی احیا کی تحریک کی مذمت کرتے ہیں تو دراصل وہ اپنے مطالعۂ تاریخ کی نفی کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس پس منظر میں پورے معاملے کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بھارت میں ہندو تعصب اور انتقام کی موجودہ لہر کا کوئی تعلق قیامِ پاکستان اور پاکستان کی تحریک نفاذِ اسلام کے ردعمل میں نہیں، بلکہ یہ سرتاپا Anti Muslim تحریک ہے، جس کی جڑیں انیسویں صدی میں مضبوط کی گئی تھیں۔ ایک پہلو اور بھی قابلِ غور ہے۔ تمام اہم سیاسی تجزیہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ ہندو انتہاپسندی کی تازہ لہر کو پروان چڑھانے میں خود اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا غیر معمولی حصّہ ہے۔ ۱۹۸۰ء کے دوران جنوبی بھارت میں مسلمانوں کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں نچلی ذات کے لوگ جب اسلام کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے، تو خود اندرا گاندھی اور بھارت کی برہمن اسٹیبلشمنٹ نے تب باقاعدہ ہندو انتہاپسندی کی حوصلہ افزائی کی۔ خصوصیت سے شمالی بھارت کی ہندو پٹی (belt) میں مسلم کش فسادات کی ایک رَو چل پڑی۔ بابری مسجد کا مسئلہ اُٹھایا گیا۔ مسلمانوں کے عائلی قوانین کو متنازع بنایا گیا اور محض سیاسی فائدہ اُٹھانے کے لیے مذہبی تعصب کی فضا پیدا کی گئی، لیکن تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ کانگریس جس نے اس فضا کو پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، وہ اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکی اور اصل فائدہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو پہنچا——فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ہندوؤں نے اس بات کو محسوس کیا کہ اب ردعمل کے طور پر بھارتی مسلمانوں کا خود اپنے اُوپر اعتماد بڑھ رہا ہے اور وہ اپنے ووٹ کا سیاسی دباؤ استعمال کر رہے ہیں۔ خصوصاً بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں جب ایمرجنسی لگائی۔ اس دوران مسلمانوں کی 'نس بندی' کا مسئلہ بھی بنیادی موضوع بنا۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف جدوجہد کی اور مسلم ووٹ نے کانگریس کی پہلی شکست اور جنتا پارٹی کی کامیابی میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔ دراصل یہی ہے وہ مقام جہاں پر ہندو انتہاپسندی نے خاص سیاسی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور اس کی بھی فکری بنیادیں انیسویں صدی سے اُٹھائی جارہی تھیں، اور یہ چیز یکایک نہیں ہوئی۔

اسی طرح میری نگاہ میں یہ بہت طویل عرصے تک رہنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوازم میں اجتماعی معاملات کے لیے کوئی واضح تصورِ حیات موجود نہیں ہے۔ معاشرت اور عدل کے بارے میں ان کے ہاں کوئی قابلِ لحاظ رہنمائی نہیں ملتی۔ مجھے مولانا مودودیؒ کی وہ تحریر یاد آرہی ہے جس میں انھوں نے ایک ہندو سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ کے پاس حقیقی الہامی مذہبی ہدایت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ص ۶۲ سے آگے: [پاکستانی معیشت کے ۷۰ سال]

بڑا مسئلہ اس وقت کھڑا ہوگیا، جب امریکی فوج نے سلالہ میں پاکستانی چوکی پر حملہ کرکے متعدد پاکستانی فوجیوں کو شہید کردیا۔ ان وجوہ سے حکومت بہت کمزور پڑگئی اور 'عالمی مالیاتی فنڈ' کے ساتھ اس کا پروگرام بھی ناکام ہوکر بند ہوگیا اور معیشت بے شمار مسائل کا شکار ہوگئی، جن میں زرمبادلہ کے ذخائر میں کمی، ملک کو ایک بار پھر دیوالیہ ہونے کے قریب لے گئی۔ مزید ابتری وزیراعظم کی سپریم کورٹ کے حکم پر نااہلی اور ایک خوفناک گردشی قرضے کی وجہ سے توانائی کے بحران نے پیدا کردی۔

اس عرصے کا دوسرا دور مسلم لیگ (ن) کی مئی ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ۱۴سال کے بعد دائرے کا سفر اسی جگہ پہنچ گیا، جہاں سے سے آغاز ہوا تھا۔ اپنی پیش رو حکومت کے مقابلے میں یہ حکومت بڑی قیادت اور واضح مینڈیٹ کی حامل تھی اور اس نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت اپنے کام کو شروع کیا، جو بہت جلد ایک نئے آئی ایم ایف پروگرام میں بدل گیا، جو تین برسوں پر محیط تھا۔ ملک کی تاریخ میں پہلی دفعہ یہ پروگرام جمہوری حکومت کے دور میں کامیاب ہوگیا اور معیشت میں استحکام واپس آگیا۔ افراطِ زر میں کمی ہوئی، شرح نمو میں رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا اور سال ۲۰۱۷ء میں اس کی شرح ۵ء۳ فی صد تک پہنچ گئی، زرمبادلہ کے ذخائر تاریخی سطح پر پہنچ گئے۔ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ CPEC کی شکل میں سرمایہ کاری کے ایک بڑے معاشی و ترقیاتی پروگرام کا سلسلہ شروع ہوا، اور توانائی اور انفراسٹرکچر کے بڑے منصوبے تعمیر و ترقی کی جانب گامزن ہوئے۔

تاہم، مسلم لیگ (ن) کی یہ حکومت بھی وقفے وقفے سے حادثات کا شکار ہوتی رہی۔ لیکن تیسرے سال، یعنی ۲۰۱۶ء میں پے دَر پے دو حادثے ایسے پیش آئے، جنھوں نے حکومت کو مفلوج کردیا: ایک 'پاناما لیکس' اور دوسرا 'ڈان لیکس'۔ ان مسائل کے دوران میں حکومت کی توجہ اہم قومی اُمور سے ایسے ہی ہٹ گئی ہے، جیسی مشرف حکومت اور پیپلز پارٹی کی حکومت کی ہٹ گئی تھی۔ گو معاشی بگاڑ کی وہ صورت نہیں پیدا ہوئی جیسا کہ ماضی میں ہوا تھا، لیکن ابتدائی اشارے اسی سمت میں سفر کی نشان دہی کررہے ہیں۔ ایک بار پھر لگتا ہے کہ ہم اسی مشکل صورتِ حال کی طرف بڑھ رہے ہیں، جہاں ہمیں پھر آئی ایم ایف کی مدد کی ضرورت پیش آنے والی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیسرے دور کو ہم نے 'کاروبار اور سیاست کا اختلاط' سے منسوب کیا ہے اور اس گفتگو کے اختتام پر ہم اس حوالے سے چند بنیادی گذارشات پیش کریں گے:

اول، اگرچہ صدر جنرل ایوب خان، صدر جنرل یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے اَدوار میں سرکاری ملازمین کو فراہم کردہ آئینی تحفظات کو ختم کر دیا اور پے در پے تین بڑی قسطوں میں بغیر وجہ بتائے اعلیٰ سرکاری افسروں کو ملازمتوں سے نکال باہر کیا گیا، لیکن اس کے باوجود سول سروس میں کچھ دَم خم باقی تھا۔ بعد کے سیاست دانوں نے سول سروس کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے پسندیدہ افسروں کے گروہ بنالیے، جس کے نتیجے میں اُن کی وفاداریاں ریاست کے بجاے حکمرانوں کو منتقل ہوگئیں۔ ان حالات میں بعض مؤثر سول سرونٹ بھی سیاست دانوں کے اس مکروہ مفاداتی عمل کا حصّہ بننے لگے۔

دوم، پارلیمانی نظام میں بنیادی طور پر حکومت وزیراعظم اور کابینہ تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں حکومتی اراکین پارلیمنٹ، حکومت سے اپنا حصّہ مانگتے ہیں۔ ان کے اس دباؤ کو کم کرنے کی خاطر ان کے لیے ترقیاتی اسکیموں کا اجرا شروع کیا گیا۔ ان کے علاقوں میں انتظامیہ کے اہم ترین عہدے داروں (DCO, SSP,SHO) کی تعیناتی ان کی خواہش اور منظوری سے ہونے لگی۔

سوم، سیاست دانوں کی پبلک سیکٹر کی کارپوریشنز اور خاص طور پر بنکوں اور مالیاتی اداروں میں زبردست مداخلت شروع ہوگئی اور ان میں نہ صرف تعیناتیاں سیاسی وابستگی اور سرپرستی کی بنیاد پر ہونے لگیں، بلکہ ان کے کاروبار کے محرکات بھی سیاسی مقاصد کے تابع ہوگئے۔ مثلاً قرضوں کا اجرا اور ان اداروں کے بنے مال کی تقسیم (اسٹیل ملز کی پیداوار کی فروخت یا گیس اور بجلی کی فراہمی)، سب کچھ سیاست کی نذر ہونے لگا۔

آخری بات یہ کہ، کاروبار اور سیاست کا اس بڑے پیمانے پر اختلاط ماضی میں نظر نہیں آتا۔ فوج اور کسی حد تک عدلیہ کو چھوڑ کر (گو ان کے ساتھ بھی طرزِ حکمرانی کے مسائل موجود ہیں اور ان پر تفصیل سے گفتگو بھی ہونی چاہیے)، سیاست، قومی ادارے اور کاروبار مربوط ہوگئے اور عوام دیکھتے رہ گئے۔ حکومت تو عوام کی جان و مال کے تحفظ کے لیے وجود میں آتی ہے، لیکن اگر یہ اُن ہاتھوں میں چلی جائے، جن سے عوام کو تحفظ چاہیے تو پھر دادرسی کی کوئی جگہ نہیں رہ جاتی اور مایوسیاں پھیلنے لگتی ہیں اور لوگ تبدیلی کے لیے ایسے راستے ڈھونڈنے لگتے ہیں، جو سیاسی عمل سے باہر ہوتے ہیں۔

© rasailojaraid.com